سہیل محمود *

ترجمہ: عمل اور روایت

ترجمے کی سرگرمی نقلِ کلام، نقلِ مطالب اور نقلِ معنی کی جدلیاتی تہہ داری پر مشتمل ہوتی ہے۔ جہاں تک نقلِ کلام کا تعلق ہے تو یہ سرگرمی ادبی متون کے ترجمے میں بالخصوص نمایاں ہوتی ہے۔ ادبی متون دراصل مخیلہ کو متحرک کرتے ہیں، کسی بھی ادبی متن میں مخیلہ کو متحرک کرنے والے عناصر میں مواد اور ہیئت دونوں شامل ہوتے ہیں۔ اگر مترجم زبان متن اور زبان آماج (میزبان زبان) دونوں میں لسانی حوالے سے درک رکھتا ہے تو تراجم میں بالعموم معالمت (supposition) زبان آماج میں منتقل ہوجاتی ہے لیکن وہ ہیئتی عناصر جو زبانِ متن میں مخیلہ کو متحرک کرتے ہیں وہ پوری طرح منتقل نہیں ہو پاتے۔

ہر مترجم کی زبان متن اور زبان آماج میں مہارت یکساں نہیں ہوتی۔ دونوں زبانوں میں مہارت کا یہ تفاعلی تعلق معالمت کی منتقلی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اکثر اوقات مترجم کی مادری یا اولین زبان زبان آماج ہوتی ہے نہ کہ زبانِ متن چنانچہ یہ حقیقت ترجمے کو یوں متاثر کرتی ہے کہ جو مواد ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے وہ اسلوب کے انھی سانچوں کے قریب تر رہنے کی کوشش کرتا ہے جو کہ زبان آماج میں پہلے سے مروج ہوتے ہیں البتہ معالمت بالعموم درستگی کے ساتھ منتقل ہوجاتی ہے لیکن اگر مترجم کی مادری یا اولین زبان، زبانِ متن ہو تو مواد کی صحت پر حرف آ سکتا ہے البتہ

اس صورت میں زبان آماج میں نئے ہیئتی اور اسلوبیاتی عناصر کے تعارف کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کے انگریزی میں وہ ترجمے جو دیسی شخصیات نے کیے ہیں وہ ہمیں زیادہ مانوس محسوس ہوتے ہیں جب کہ وہ تراجم جو انگریزوں نے کیے ہیں وہ نسبتاً کم مانوس لگتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک انگریز کے نزدیک اردو شاعری کے وہ انگریزی تراجم جو کسی انگریز نے کیے ہوں زیادہ وقیع قرار پائیں گے، بہ نسبت اُن کے جو کسی دیسی شخصیت نے کیے ہوں۔

متن کی پہلی پرت اس کی معالمت ہے۔ پیچیدہ ادبی متن میں اسے ثانوی اہمیت حاصل ہوتی ہے لیکن تمام تر صحافتی اور علمی تحریروں میں یہ متن کی اولین قدر رہوتی ہے۔ یہاں ادبی متن کے تراجم میں ثانوی اہمیت ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی صحت پر سمجھوتہ ہوسکتا ہے بلکہ صرف اس حقیقت کی یاددہانی مطلوب ہے کہ صحافتی اور علمی تحریروں کے اوپر کوئی اور پرت نہیں ہوتی جب کہ پیچیدہ ادبی متن میں معالمت سے اوپر بھی متن کی ایک پرت موجود ہوتی ہے۔

زبانیں خالی برتن نہیں ہوتیں کہ جن میں معالمت کو بھر کر ایک سے دوسری جگہ منتقل کیا جائے۔ زبانوں کی علامتوں اور الفاظ کے ساتھ کئی قسم کے تلازمات وابستہ ہوتے ہیں۔ ان تلازمات میں کسی قوم کی ثقافت، تہذیب، تاریخ، جغرافیہ اور تصورات تمدن شامل ہیں اور جب ہم کسی خاص زبان سے کوئی متن کسی اور زبان میں ترجمہ کرتے ہیں تو اگر چہ اساسی زبان یا زبان متن کے بہت سے تلازمات ضائع ہوجاتے ہیں لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ زبان آماج کے الفاظ اور علامتوں سے وابستہ تلازمات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر ہم 'معالمت' کو ترجمے کا ایک یونٹ تصور کرلیں تو اس پر مترجم کی ذات کئی لاشعوری حوالوں کے ساتھ اثر انداز ہوسکتی ہے اور نتیجتاً 'معالمت' کا ترجمہ بدل سکتا ہے۔

مترجم کا لاشعور اور ترجمے کی معالمت

زبان متن اور زبان آماج میں یکساں استعداد رکھنے والے دو مترجم ایک سے خلوص اور تندہی کے باوجود اپنے لاشعوری پس منظر کی وجہ سے ایک ہی معالمت کے دو مختلف تراجم کریں گے۔ ان لاشعوری حوالوں میں سے ایک ثقافت ہے۔ رولاں بارت (Roland Barthes) کے مطابق متن ثقافت کی بافت ہوتا ہے۔[1] ثقافت متن میں گندھی ہوئی ہوتی ہے اور ترجمے کے عمل میں معالمت کے

مختلف اجزا مترجم کی اپنی ثقافت کا چولا پہن لیتے ہیں۔ گجرات یونی ورسٹی میں ایک سیمینار میں معروف افسانہ و ناول نگار انتظار حسین اپنے ایک خطاب میں ترجمے کے ثقافتی پہلو کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ترجمے میں تہذیبی سانچے کی سمائی جیسے دیکھنی ہو تو قدیم ہند کی داستانوں کے پرانے اردو ترجمے دیکھیے، مثلاً شیو پران کی مہا دیو جی کی شان میں کے مترجم نے مہا دیو جی کی مدح و ثنا کو حمد باری تعالیٰ بنا دیا۔ اسی ترجمے میں مترجم نے خوش اسلوبی سے ہندو دیو مالا میں ملائکہ کو داخلہ دے دیا۔ مہا بھارت کے ایک مترجم نے اس دیو مالا میں لوح و قلم کے تصور کو بھی سمو دیا ہے۔ اس طرح والمیک جی کی راماءن میر انیس کا مرثیہ بن گئی، مگر اس ترجمے میں راماءن کی خوشبو اڑ گئی ہے۔ رفیق خاور نے ایلیٹ کی "دی ویسٹ لینڈ" کا ترجمہ اسی نسخے کے تحت کیا۔[۲]

ایک بڑے اخبار میں صحافی بننے کے امیدوار کو غیر ملکی اخبار کا تراشہ ترجمہ کرنے کے لیے دیا گیا تو اس نے انگریزی معالمت "Osama is the most wanted in America" کا ترجمہ یوں کیا "اسامہ امریکا میں سب سے زیادہ چاہا جانے والا شخص ہے"۔ اس ترجمے میں اگرچہ لسانی یا لغوی حوالے سے کوئی خامی نہیں ہے لیکن انگریزی محاورے کا مناسب علم نہ ہونے کی وجہ سے اس پوری معالمت کا ترجمہ غلط ہو گیا۔

ایک دوسرا حوالہ لسانیات ہے۔ مترجم جس لسانی روایت سے تعلق رکھتا ہے اس کا بھی ترجمے پر اثر پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر عربی میں اختصار کی نمایاں خصوصیت ہے۔ سورۃ الفاتحہ کے عربی الفاظ بمشکل ۲۵ ہیں لیکن اس کے انگریزی ترجمے میں کم از کم ۴۵ الفاظ موجود ہیں۔ ہر لفظ کے ساتھ اضافی تلازمات وابستہ ہوتے ہیں اور ترجمے میں اصل متن سے جتنے لفظ زیادہ آتے ہیں اتنا ہی ترجمہ تبصرے کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔ ہوپی (Hopi) زبان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں مستقبل کا صیغہ زیادہ نمایاں نہیں ہے چنانچہ ہوپی زبان میں یا ہوپی زبان سے اگر کوئی ترجمہ کیا جا رہا ہے تو لسانی بندشیں ترجمے پر اثر انداز ہوں گی۔ مزید برآں ہر مترجم کا اپنی زبان کے وسائل پر یکساں تصرف نہیں ہوتا۔ اپنی زبان کی کتنی لغت اس کے تحت الشعور میں موجود ہے اس امر کا ترجمے پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

ذوق مطالعہ کا فرق اور مطالعے کی ریاضت بھی ہر مترجم کے لسانی شعور کی انفرادیت کو ابھارتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دو مترجمین کی ترجمہ کی ہوئی مسلسل تیسری معالمت کبھی ایک دوسرے کے مماثل نہیں ہوسکتی۔یہ حقیقت ترجموں میں سرقے کی نشاندہی کا ایک شاندار آلہ بھی ہے۔

تیسرا اہم عنصر جو ترجمے پر اثرانداز ہوتا ہے وہ مترجم کا فلسفۂ حیات ہے۔وہ جس برتر ضابطۂ حیات کا پیرو ہوتا ہے اس سے مختلف معالمت کو بعض اوقات وہ سمجھ ہی نہیں پاتا۔ یہ براہ راست متن کی تفہیم کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ متن میں موجود ان الفاظ کا معاملہ ہے جن کے معنی کو مترجم کا فعال فلسفۂ حیات ان تلازمات کی طرف منتقل کردیتا ہے جو اس کے لیے زیادہ قابل قبول ہوتے ہیں۔مترجم کی شخصیت میں انتہاپسندی کا رویہ جتنا زیادہ ہوگا اسی نسبت سے اس کے ترجمے میں یہ سقم نمایاں ہوگا۔ تاہم تشکیک پر یقین کے رویے اور مناسب ریاضت سے اس سقم پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

ترجمے پر اثرانداز ہونے والا ایک اور عنصر تاریخ ہے۔مترجم اپنی شناخت، اپنی تاریخ اور اپنی سیاسی وابستگیوں سے حاصل کرتا ہے۔کسی خطے یا قوم کی تاریخ کے کچھ خاص حصے اس کی شناخت کا اٹوٹ حصہ ہوتے ہیں چنانچہ جب متن میں تاریخ کا موجودہ سیاسی صف بندیوں کے حوالے سے کوئی جداگانہ نقطۂ نظر اس کے روبرو آتا ہے تو ترجمے میں متن کی شدت اور لب ولہجہ برقرار نہیں رہ پاتے۔ ایسے مرحلے میں ترجمے میں پیش ہونے والی معالمت بالعموم متن میں پیش ہونے والی معالمت سے طویل تر ہوتی ہے کیونکہ مترجم لاشعوری طور پر اپنے اختلاف کو کھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اختلاف ترجمے میں نہ تو مبرہن ہوتا ہے اور نہ ہی انفرادی نوعیت کا ہوتا ہے۔یہ کسی خاص قوم، قبیلے یا گروہ کے اجتماعی شعور سے تشکیل پاتا ہے اور اسی سبب سے ترجمہ کسی خاص خطے کی قوم میں قبولیت پاتا ہے۔

ترجمے کو متاثر کرنے کا ایک بیرونی عامل معیشت واقتصادیات ہے۔مترجم بالعموم 'معاشی فوائد' کے لیے ترجمہ کرتا ہے۔یہ حقیقت بھی ترجمے کے معیار پر اثرانداز ہوتی ہے کیونکہ جس ترجمے کے توسط سے زیادہ معاشی افادے کا امکان ہو اسے مترجم زیادہ احتیاط اور دلچسپی سے کرے گا برعکس اس کے اگر ترجمے سے وابستہ معاشی افادہ کم ہے تو مترجم اس متن کو زیادہ دھیان سے ترجمہ نہیں کرے گا۔ مزید برآں اگر مصنف اپنے میلان طبع سے ہی کسی متن کا انتخاب کرتا ہے تو بالعموم یہ متن اسی زبان سے

تعلق رکھتا ہے جس زبان کی اپنی معاشی قدر دیگر زبانوں کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں انگریزی، فرانسیسی اور روسی تحریروں کے تراجم تو مل جائیں گے لیکن میسو امریکن (Mesoamerican languages)؛ ہوپی، ایزٹیک اور مایا زبانوں سے تراجم نہیں ملیں گے۔

ترجمے کو متاثر کرنے والا ایک اور اہم عنصر جنس ہے۔ سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) کے مطابق جنس انسانی افعال کا ایک اساسی محرک ہے۔ متن سے ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کے صنفی اور جنسی نظریات اس کی تحریر پر نمایاں اثر ڈالتے ہیں۔ مترجم بالعموم اپنے معاشی مفاد کے تحت ترجمہ کرتا ہے لیکن جب وہ اپنے میلانِ طبع کے لحاظ سے ترجمے کے لیے کسی متن کا انتخاب کرتا ہے تو اس متن میں موجود جنس کے حوالے سے خود مترجم کے نظریۂ جنس کا تفاعلی تعلق اس انتخاب کا ایک اساسی محرک ہوتا ہے۔ نسائیت پرست یا تانیثی فلسفے سے متاثر ایک خاتون مترجم کسی صنفی یا جنسی حوالوں سے معمور متن کے ترجمے میں ان عناصر کو لاشعوری طور پر متن کی نسبت زیادہ نمایاں کرسکتی ہے جو خواتین کی جنسی خود مختاری کو نمایاں کرتے ہوں جب کہ ایک مذہبی پس منظر کا حامل شخص اسی متن کے ترجمے میں چند ایسے عناصر کو متن کی نسبت زیادہ نمایاں کرسکتا ہے جن میں مردانہ حاکمیت کو اہمیت دی گئی ہو۔ ترجمے کے دوران متن میں موجود جنسی حوالے بھی اس کے صنفی نظریے کے تحت ترجمہ ہوتے ہیں لیکن خود متن سے مترجم کا جنس کے حوالے سے رویہ بھی رفتہ رفتہ تبدیل ہوتا ہے۔

ترجمے کا انحصار ایک اور بیرونی عامل 'ذرائع ابلاغ' پر بھی ہوتا ہے۔ مترجم اکثر اوقات درکار الفاظ کے ایسے مترادفات زیادہ استعمال کرتے ہیں جن کا ذرائع ابلاغ میں کثرت سے استعمال ہو رہا ہوتا ہے۔ ہائی فریکوئنسی والے یہ الفاظ مترجم کے تحت الشعور میں موجود ہوتے ہیں اور بعض اوقات سہل پسندی کے اضطراری رویے کے باعث وہی الفاظ استعمال کرلیے جاتے ہیں۔ ترجمے پر ذرائع ابلاغ کے اثر کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ ذرائع ابلاغ بہت تیز رفتاری سے الفاظ کو یا تو کلیشوں میں بدل دیتے ہیں اور یا پھر ان سے وابستہ تناظر کو تبدیل کردیتے ہیں۔ مترجم کو لفظوں کے بدلتے ہوئے تناظر کا احساس ہونا چاہیے۔ جہاں یہ ضروری ہے کہ مترجم سہل پسندی کو غالب نہ آنے دے، وہیں اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ وہ الفاظ کو ان کے بدلے ہوئے تناظر میں پہچان سکے یعنی ذرائع ابلاغ سے مستفید

بھی ہوتا رہے۔

اس طرح یہ سب لاشعوری عوامل ادبیات، علوم اور فنون کے تراجم کی معالمت کی پرت کو متاثر کرتے ہیں اور ترجمے کے ابلاغی معیار پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

علمی تراجم

معالمت کی پرت ایک معین سے فرق کے ساتھ ادبی، علمی، صحافتی اور فنی ہر قسم کے ترجمے میں شامل ہوتی ہے۔ اردو میں مختلف اداروں اور افراد نے ترجموں کے ضمن میں خاصا قابل قدر کام کیا ہے۔ علمی و فنی تراجم تہذیبی عمل کو کس کس طرح متاثر کرتے ہیں اس کا اندازہ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کے ان خیالات سے کیا جا سکتا ہے۔

> ترجمے ایک طرف تو علم و حکمت کے منطقے کو وسیع کرتے ہیں اور دوسری طرف دو مختلف تہذیبوں کے اعلیٰ ترین جوہر کو مدغم کر کے انسانی تہذیب کی توانائیوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ کسی زبان کے الفاظ اور فقرے نہ صرف یہ کہ معاشرے کے حریت فکر و احساس کے غماز ہوتے ہیں بلکہ یہ بھی کہ وہ پورے معاشرتی ڈھانچے اور اس کی ساخت و باخت کے بھی عکاس ہوتے ہیں۔ لہٰذا ترجموں کے ذریعے نئے سانچوں اور اسالیب کے نئے نمونوں کو زبان میں داخل کرنے کے معنی زندگی کے جمود کو توڑنا اور تحرک کی نئی قوتوں کو بروئے کار لانا ہے۔[۳]

اردو میں علمی تراجم کی ایک روایت مذہب سے نکلتی ہے۔ ان میں سے ایک روایت ترجمۂ قرآن ہے۔ اگرچہ اردو سے بہت پہلے برصغیر کی ایک زبان سندھی میں ہندو راجاؤں کے دور میں ترجمہ ہو چکا تھا، یہ ترجمہ خالصتاً علمی نقطۂ نظر سے کیا گیا تھا۔ حضرت سلمان فارسی سے منسوب سورۃ الفاتحہ کے فارسی ترجمے کے سوا قرآن پاک کے فارسی سمیت دیگر تمام زبانوں میں تراجم سندھی میں ترجمۂ قرآن کے بعد ہوئے۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں شاہ ولی اللہ نے خود بھی فارسی میں قرآن پاک کا ایک ترجمہ کیا تھا لیکن اردو میں قرآن پاک کے ترجمے کا آغاز ان کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین سے ہوتا ہے جنھوں نے قرآن پاک کا لفظی ترجمہ کیا۔ اس ترجمے میں چونکہ عربی کی نحوی ترتیب کو پیش نظر رکھا گیا اس لیے یہ معالمت کی ترسیل میں مکمل طور پر ناکام رہا۔ یہ ایک طرح سے قرآنی الفاظ کی فرہنگ تھی

جس میں ہر عربی لفظ کا ترجمہ لکھا ہوا تھا۔ اس روایت کو ان کے بھائی شاہ عبدالقادر نے آگے بڑھایا جنھوں نے پہلی مرتبہ قرآن پاک کا اس وقت کے مروجہ اردو روزمرہ اور محاورے کی رعایت سے ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ خاصا مقبول ہوا۔ شاہ عبدالقادر نے قرآن پاک کے علاوہ احادیث کے تراجم بھی کیے جو مذہبی تدریس کے سلسلے میں خاصے مقبول ہوئے۔

اردو میں قرآن پاک کے تراجم سے بہت پہلے سترھویں صدی کے وسط تک چرچ بائبل کے ترجمے پر کام کر چکا تھا۔ ۱۷۴۵ء میں ایک جرمن مشنری جارج شلز نے عہد نامہ جدید کے کچھ حصوں کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ شاہ رفیع الدین کے ترجمۂ قرآن کے آتے آتے اردو میں بائبل کے ترجمے کے نئے ایڈیشن بھی شائع ہو چکے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں پوری بائبل کا ترجمہ رابرٹ کاٹن ماتھر (Robert Cotton Mather) نے مرزا پور سے شائع کیا تھا۔[۴]

اردو میں غیر مذہبی نوعیت کے علمی اور فنی تراجم میں اولیت ڈپٹی نذیر احمد کی تعزیرات ہند کو دی جاتی ہے لیکن ان کے ترجمے سے ۱۷ برس پیشتر ایک انگریز کمشنر ایلیٹ نے ۱۸۴۷ء میں تعزیرات ہند کا ترجمہ کیا تھا۔[۵] اردو میں ترجمہ ہونے والی پہلی سائنسی کتاب ٹریٹائز آن منرل ڈیپازٹس (*Treaties on Mineral Deposits*) ہے۔ مصنف اور مترجم کا نام یا مقام موجود نہیں ہے لیکن اس پر تاریخ طباعت ۱۵ جولائی ۱۸۲۶ء کی ہے۔[۶] ۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۰ء کے عرصے تک دکن کی کسی علم دوست شخصیت کے ایما پر ریورنڈ چارلس (Reverend Charles) کی پانچ کتابوں کو میر امان اللہ دہلوی، غلام محی الدین حیدرآبادی، مسٹر جولس اور موسیو تندہی نے 'علم جرثقیل'، 'علم آب وہوا'، 'علم مناظر' اور 'علم برق ومقناطیس' کے عنوانات کے تحت شائع کیا۔[۷] طارق محمود کی تحقیق کے مطابق:

> ترجمہ مطابق اصل تھا اور پیرایہ سوال وجواب کا تھا، نقشے بھی دیے گئے تھے، زبان صاف اور سلیس تھی اور اصطلاحات کے لیے عربی وفارسی کے مروجہ الفاظ استعمال ہوئے تھے۔ البتہ جہاں ان زبانوں میں متبادل لفظ نہیں ملا تھا وہاں انگریزی اصطلاح برقرار رکھی گئی تھی۔[۸]

دکن ہی کی طرح تراجم کا ایک مفید سلسلہ لکھنؤ سے بھی شروع ہوا لیکن یہاں اس کا محرک نوابی دور میں قائم ہونے والی ایک رصدگاہ تھی جس کے سربراہ کرنل رچرڈ ولکاکس (Richard

Wilcox) کی نگرانی میں ایک کارکن مولوی کمال الدین نے 'علم الہوا'، 'نوریات'، 'بصریات'، 'طبیعیات'، 'آلات ریاضی'، 'مقناطیس' اور 'کیمیا' وغیرہ پر بارہ رسائل کا اردو میں ترجمہ کیا جو دستبرد زمانہ کی نذر ہو گئے۔[9]

علمی اور فنی تراجم کے سلسلے میں اداروں میں سے اولین نام دہلی کالج ہے۔ یہاں ایک ورنیکولر لینگویج سوسائٹی قائم کی گئی۔ اس سوسائٹی نے مترجمین کے لیے جو اصول اور ضوابط مرتب کیے تھے وہ کچھ یوں تھے:

> ترجمہ لفظ بہ لفظ نہ کیا جائے بلکہ ان کا اصل مقصد صحیح مفہوم کی ادائیگی ہونا چاہیے خواہ ترجمے میں جملے کی ساخت کیسی ہی کیوں نہ بدل جائے۔ اس دور کی زبان اس دور کے مزاج کے مطابق سلیس اور سادہ ہو۔[10]

جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ کا سائنسی علوم کے ترجمے کی روایت کی تشکیل میں اہم کردار ہے۔ اس ادارے نے ریاضی، کیمیا، تاریخ، معاشیات، سیاسیات، قانون، نفسیات، انجینئرنگ اور فلسفے وغیرہ پر کتابیں ترجمہ کر کے شائع کرائیں جس سے اردو کے ابلاغی دامن میں خاطر خواہ وسعت آئی اور وہ ان نئے معروضی علوم کو سہارنے کے لائق ہو گئی۔ دارالترجمہ کی اشاعتی سرگرمیوں کا آغاز ۱۹۱۷ء سے شروع ہو کر ۱۹۵۱ء تک جاری رہا ان ۳۵ برسوں میں اس نے سیکڑوں کتابیں ترجمہ کرا کے شائع کیں۔ مرزا حامد بیگ کے مطابق دارالترجمہ کا طریقہ کار کچھ یوں تھا کہ مختلف مضامین کے حوالے سے ماہرین کی کمیٹیاں دیگر زبانوں (بالعموم انگریزی سے) کتابوں کا انتخاب کر کے متعلقہ حکام کی منظوری سے دارالترجمہ کو بھجوا دیتیں، جب ترجمہ ہو جاتا تو اس شعبے سے متعلق ماہرین فن نظر ثانی کرتے، اس کے بعد یہ ترجمہ طباعت کے مراحل سے گذرتا۔ اس دوران مترجمین ایسی اصطلاحات کی فہرستیں بھی ماہرین کی متعلقہ کمیٹیوں کو بھجواتے رہتے جن کے بارے میں ان کا خیال یہ ہوتا تھا کہ ان کے مترادفات پہلے سے اردو میں موجود ہیں۔[11]

جن لوگوں کو علوم کے ترجمے پر مامور کیا گیا تھا وہ نہ صرف اردو کے نامور لکھاری تھے بلکہ انھیں عربی اور فارسی زبان و ادبیات میں بھی گہرا درک تھا اور یوں وہ اردو میں ادائے مفہوم و مطالب پر

پوری طرح دسترس رکھتے تھے۔ان تراجم کے حوالے سے بعض اوقات دقیق ہونے کی شکایت بھی سامنے آتی رہی ہے۔ہلال احمد زبیری کا استدلال یہ ہے کہ دراصل اس زمانے میں عربی و فارسی کا رواج زیادہ تھا جس کی وجہ سے یہ آج کی اردو کی نسبت کچھ دقیق ضرور محسوس ہوتے ہیں لیکن ان مترجمین کو ایک تو اپنی زبان پر پورا اعتماد تھا اور دوسرے وہ کسی احساس کمتری میں مبتلا نہیں تھے،چنانچہ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے معاملت (اداے مطالب) میں کہیں کوئی کوتاہی کی۔[۱۲]

سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی ایک تحریک تھی جس کے زیرِ اثر ہندوستان کے مختلف شہروں میں اسی نام کی انجمنیں قائم ہوئیں۔ان میں سب سے قابلِ ذکر مظفر پور، صوبہ بہار کی سائنٹفک سوسائٹی ہے جو ۲۲ مئی ۱۸۶۸ء کو قائم ہوئی۔یہاں سے سیاسیات، فلکیات، جغرافیہ، جبر و مقابلہ، طبیعیات، معدنیات، علم مثلث اور فنِ تعمیر پر کتابیں شائع ہوئیں۔ترجمے کا کام کرنے والوں میں سرفہرست رائے سوہن لال، سپرنٹنڈنٹ نارمل اسکول پٹنہ کا نام آتا ہے۔[۱۳] انجمن ترقی اردو نے بھی عالمی ادب، علاقائی ادب اور دیگر علوم و فنون کے تراجم کا عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔انجمن کے زیرِ اہتمام سہ ماہی رسالہ سائنس بھی شائع ہوا جو زیادہ عرصہ چل تو نہ سکا مگر اس رسالے نے جدید مغربی تحقیقات کے تراجم اور مقامی ماہرین کی نگارشات کے ذریعے 'سائنسی طرزِ فکر' کے آغاز میں بھرپور کردار ادا کیا۔[۱۴] مجلس ترقی ادب لاہور ترجمے کے ضمن میں ایک اور اہم ادارہ ہے۔۱۹۵۰ء میں قائم ہونے والا یہ ادارہ محکمۂ تعلیم پنجاب نے قائم کیا تھا۔پروفیسر صفدر علی اس ادارے کے اغراض و مقاصد کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> مجلس کے جو اغراض و مقاصد متعین ہوئے وہ درج ذیل ہیں:
>
> ۱۔ کلاسیکی ادب شائع کرنے کا مناسب اہتمام
>
> ۲۔ بلند پایہ ادب کی اشاعت
>
> ۳۔ غیر زبانوں کی معیاری کتب کا ترجمہ کرا کے شائع کرنا
>
> ۴۔ ہر سال بہترین مطبوعہ مضامین اور منظومات پر انعام دینا۔[۱۵]

مجلس کا اولین ہدف چونکہ 'ترقی ادب' ہے اس لیے مجلس کی خدمات کا بیشتر حصہ بھی معیاری اور کلاسیکی سرمائے کی بازیافت کے علاوہ اردو ادبیات کے حوالے سے تحقیقی و تنقیدی مضامین کے فروغ تک محدود رہا۔ترجمے کی سرگرمی کی بالعموم ثانوی حیثیت رہی تاہم شہزاد احمد کے دورِ نظامت میں ان کی

ذاتی افتادِ طبع کے باعث فلسفہ، عمرانیات اور بشریات پر کتابوں کا ترجمہ بھی ہوا۔ اکادمی ادبیات پاکستان ۷ جولائی ۱۹۷۶ء کو اسلام آباد میں قائم ہوئی۔ اس کو حکومت پاکستان کی وزارت تعلیم نے قائم کیا اور اپریل ۱۹۷۸ء میں اس کے اغراض و مقاصد طے ہوئے، مجلس نظما کا قیام عمل میں آیا اور مجلس رفقائے اساسی کی تشکیل ہوئی۔ اس کے بعد اکادمی نے ایک سرگرم اور فعال ادارے کی حیثیت سے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔ اس کے اغراض و مقاصد کی طویل فہرست میں کم از کم تین ترجمے سے متعلق تھے جن میں نمبر ۳ پاکستان کے مختلف علاقوں کے لوگوں کے درمیان بہتر قومی ہم آہنگی اور فکری مفاہمت کو فروغ دینے کے لیے شعبۂ ترجمہ قائم کرنا جو قومی اور علاقائی زبانوں کی منتخب تصانیف کو علاقائی اور قومی زبانوں میں منتقل کرے گا۔ نمبر ۴ قومی اور علاقائی زبانوں میں حوالے کی معیاری کتابوں، لغات و قاموس وغیرہ کی تیاری اور نگرانی کرنا۔ نمبر ۷ غیر ملکی قارئین کو پاکستانی ادبیات سے متعارف کرانے کے لیے مناسب اقدامات کرنا شامل ہیں۔ کراچی یونی ورسٹی کے شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کے تحت مختلف علمی موضوعات پر بیسیوں تراجم ہو چکے ہیں، ان تراجم میں مفرس اور معرب عناصر زیادہ ہیں۔ پنجاب یونی ورسٹی لاہور اور فیصل آباد یونی ورسٹی میں بھی تراجم کا کام ہوا ہے، مقتدرہ قومی زبان نے خالصتاً فلسفیانہ اور مستقبلیاتی عناصر کے حامل موضوعات کو تراجم کے لیے چنا۔ یہ وہ موضوعات ہیں جنھیں دیگر ادارے بھاری پتھر جان کر چھوڑ دیتے ہیں۔ ان تمام اداروں نے تراجم کے ساتھ ساتھ علمی اور فنیاتی تراجم کے ایک اہم عنصر وضع اصطلاحات پر بھی قابل ذکر کام کیا ہے۔

محولہ بالا شخصیات اور اداروں کی جانب سے ہونے والے تراجم کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ علمی اور فنیاتی تراجم کی اٹھان بہت متاثر کن تھی۔ اس دور میں بحیثیت مجموعی فطری علوم کو عمرانی علوم پر ترجیح دی گئی لیکن رفتہ رفتہ اس نوعیت کے تراجم میں کمی آتی گئی اور بالآخر یہ رویہ اسی دور میں حنوط ہو کر رہ گیا۔ تدریسی مقاصد کے لیے فطری علوم کے چند ایک تراجم دیکھنے میں ملتے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی اس نوعیت کے تراجم کی اردو میں شدید قلت ہے؛ ریاضی، طبیعیات، کیمیا، حیاتیات، فلکیات، بصریات، جدید طب کے حوالے سے بڑی اور معروف کتب کے تراجم ہمیں دستیاب نہیں ہیں اور اس کی وجہ سے اردو کے ابلاغی مزاج میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہوتا ہے۔ فطری علوم کے تراجم کے حوالے سے

موجودہ انفعالی رویے کی دو بڑی وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ خود ہمارے معاشرے میں بوجوہ ان مضامین کی طلب بہت کم ہے اور دوسرے یہ کہ گذشتہ اور موجودہ صدی میں فطری علوم نے جس قدر تیزی سے ترقی کی ہے وہ دماغ کو مختل کر دیتی ہے۔ انفرادی مترجمین کی تو بات ہی چھوڑیے، ترجمے سے متعلق اداروں کو بھی ابتدا کے لیے کوئی سرا ہاتھ نہیں آتا۔

لیکن اگر معروف علوم کی حد تک بھی تسلسل کے ساتھ تراجم ہوتے رہتے تو صورتحال اتنی ناگفتہ بہ نہ ہوتی۔ تیسرے ہزاریے کی پہلی دہائی میں فطری علوم کے سنجیدہ مطالعات کے تراجم کی کئی قابل قدر کوششیں کی گئی ہیں ان میں سے ایک اسٹیفن ہاکنگ کی کتاب وقت کی تاریخ کا ترجمہ ہے جسے مشتے از خروارے کے طور پر منتخب کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں معاملت کی اٹھان اچھی ہے لیکن بات جب وقت کے مخروط تک پہنچتی ہے تو مترجم معاملت کو اردو میں منتقل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ ترجمے کے اسلوب میں ایک کھردرا پن موجود ہے لیکن اس کا دوش مترجم کو اس لیے نہیں دیا جا سکتا کہ اس سطح کے تراجم کے پس منظر میں اس سے پہلے ہونے والی سائنسی پیشرفتوں پر تسلسل کے ساتھ ترجمے کی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ فطری علوم کے تراجم کے لیے ضروری ہے کہ جس موضوع پر نیا ترجمہ کیا جا رہا ہے اس نے اسی موضوع پر ہونے والے گذشتہ تراجم کا ہاتھ پکڑا ہوا ہو لیکن اگر روایت میں اس موضوع پر پہلے سے تراجم موجود ہی نہیں تو نئے تراجم میں لامحالہ کھردرا پن موجود ہوگا۔ قاسم یعقوب نے اپنے مضمون ''اردو میں تراجم: نئی ضروریات اور مسائل'' میں اس مشکل کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

> اُردو برصغیر میں مختلف لسانیاتی جمعیتوں کی نمائندہ ہونے کی وجہ سے اپنے اندر مختلف وسیع تجربات کے اظہار کا مادہ رکھتی ہے مگر سائنسی و علمی ضروریات سے پیدا شدہ تشنگی کا احساس بھی دامن میں لیے ہوئے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مقامی اہلِ فکر نے ان میدانوں میں حال ہی میں اپنے آپ کو پیش کیا۔ سائنس اپنے فکری خدوخال میں جمہوری نہیں ہر سال نئے مباحث نئے علمی دروا کر رہے ہیں جس کی وجہ سے اردو کو از سرِ نو مرتب کر کے اس میں تخلیقی سائنسی اظہار ناممکن نہیں تو مشکل ضرور بن گیا ہے۔[۱۴]

بعض اوقات ترجمے میں کھردرے پن کی دیگر وجوہات بھی ہوتی ہیں جن میں سب سے

بڑی وجہ مترجم کی سہل پسندی ہوتی ہے۔اگر کسی موضوع پر تسلسل کے ساتھ تراجم کی روایت موجود ہے تو اس صورت میں مترجم کے ترجمے میں موجود کھردرے پن کا واحد مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے موضوع کے سیاق کا اچھی طرح جائزہ نہیں لیا۔وہ اپنے موضوع کی مبادیات سے کماحقہ آگاہ نہیں ہے۔

عمرانی علوم کے علمی تراجم کی بہترین صورت یہ ہے کہ متن کے بجائے مفہوم کے قریب رہا جائے۔یعنی لفظی ترجمہ تو برطرف یہ جملوں کی بنیاد پر ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔علمی تراجم میں اچھا ترجمہ وہ ہے جو ایک پورے پیراگراف کی معالمت یا اس سے بھی بڑے یونٹس کو بنیاد بنا کر کیا جائے۔ ہاں اصطلاح کو اصطلاح کے طور پر ہی جملے میں اس کے مقام پر ہی آنا چاہیے۔بہترین صورت یہ ہے کہ علمی موضوع کو سمجھنے کے لیے محض نقد متن تک محدود نہ رہا جائے بلکہ دیگر ذرائع سے بھی موضوع کا سیاق وسباق کھنگال کر اس پر دسترس حاصل کی جائے۔اس طرح مترجم محض ایک میکانکی میڈیم نہیں رہے گا جو ایک زبان میں موجود معالمت کو دوسری زبان میں منعکس کر دیتا ہے بلکہ وہ اس معالمت کو اپنے نظام ہضم سے گذار کر ایک نئی صورت میں سامنے لائے گا۔اس سطح پر علمی ترجمہ تخلیقی شان حاصل کر لیتا ہے۔اس میں موجود کھردرا پن ختم ہوجاتا ہے اور وہ ترجمے سے زیادہ طبع زاد تحریر معلوم ہونے لگتی ہے۔

فنی تراجم

فنی ترجمے میں چونکہ جزئیات سب سے اہم ہوتی ہیں اس لیے جتنا متن کے قریب رہا جائے اتنا اچھا ہے۔فنی علوم میں اصطلاحیں بکثرت استعمال ہوتی ہیں۔اصطلاحیں اگرچہ علمی تراجم میں بھی بڑے پیمانے پر استعمال ہوتی ہیں لیکن فنی تراجم میں ان کا استعمال کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ڈاکٹر رؤف پاریکھ ایک عام لفظ اور اصطلاح کا فرق اس طرح واضح کرتے ہیں کہ:

> لفظ ایک تصور کی صوتی علامت ہوتا ہے، اگر لفظ کے تصوری مواد اور علامتی ہیئت کا رشتہ ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہے یعنی اس کی دلالت وسیع اور پھیلی ہوتی ہے تو یہ عام قسم کا لفظ ہے۔اگر تصور اور صوتی اعلام کا رشتہ کسا ہوا ہوتا ہے یعنی دلالت تنگ اور کسی ہوئی ہوتی ہے تو اسے اصطلاح کہتے ہیں۔[۱۷]

اصطلاحوں کے تراجم دراصل ترجمے کی تیسری پرت بناتے ہیں۔ان سے زبان آماج کے

چھوٹے یونٹس؛ الفاظ، علامتوں اور تراکیب کی ابلاغی استعداد میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ امر ادبی تراجم کی نسبت علمی اور فنی تراجم میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ سائنسی، علمی اور فنی تراجم دوسری زبانوں کے علمی و فنی خزینوں سے کسب فیض کے لیے استعمال ہوتے ہیں جس سے معاملت کی پرت کھلتی ہے لیکن ان تراجم سے زبان آماج کو جو فائدہ پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو زبان میں نئے الفاظ اور نئی تراکیب کے ساتھ ساتھ نئے الفاظ وضع کرنے کے نئے اصول متعارف ہوتے ہیں یا پرانے اصولوں میں رد و بدل ہوتا ہے دوسرے ان الفاظ یا صوتی علامتوں کے ساتھ تصور کی تنگ یا کسی ہوئی دلالت کے باعث اصطلاحوں پر مشتمل الفاظ عام معنوں میں پامال ہونے سے بچ جاتے ہیں۔

شعری ادب کے تراجم

شعری تراجم میں کلام کا حُسن صرف ان زبانوں میں ترجمہ ہوسکتا ہے، جن کے شعری نظام ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہوں۔ دراصل ہر زبان اپنا ایک منفرد شعری نظام رکھتی ہے جس میں اس کی بحریں، تلازمات، تلمیحات، تشبیہات، استعارے اور دیگر شعری صنعتیں شامل ہوتی ہیں۔ یہ شعری نظام اپنے اندر کسی غیر زبان کے شعری نظام کا پیوند گوارا نہیں کرتا چنانچہ سیموئل جانسن (Samuel Johnson) کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ادبی تراجم اور بالخصوص شاعری کے تراجم کا حُسن دوسری زبان میں پوری طرح منتقل نہیں ہوسکتا۔ تاہم اِس کلیے میں یہ استثنیٰ ضرور موجود ہے کہ وہ دو زبانیں جن کے شعری نظام میں مماثلتیں پائی جاتی ہوں، ان کی شاعری کو ایک سے دوسری زبان میں ترجمہ کیا جائے تو وہ ترجمہ گوارا ہوسکتا ہے اس کی مثال کلاسیکی فارسی اور اردو شاعری ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم اس ضمن میں کہتے ہیں کہ:

> دونوں زبانوں میں نہ صرف بحریں مشترک ہیں بلکہ الفاظ، تلازمے، سماجی تصورات، تلمیحیں، تشبیہیں اور استعارے بھی مشترک ہیں، اس لیے مترجم کو زیادہ دشواری نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات تو ایک آدھ فعل کا ترجمہ کردینے سے کام بن جاتا ہے مثلاً فارسی کا ایک شعر ہے
>
> آلودۂ قطراتِ عرق دیدہ جبیں را
> اختر ز فلک می نگرد روئے زمیں را

رفیع سودا نے اس کا ترجمہ کچھ یوں کیا ہے کہ

آلودۂ قطراتِ عرق دیکھ جبیں کو
اختر پڑے جھانکے ہیں فلک پر سے زمیں کو[18]

دونوں زبانوں کا شعری نظام اگر بہت حد تک مماثل ہو تو بھی ایک مشکل باقی رہ جاتی ہے اور وہ شعر کی معنوی تہہ داری ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی وجہ سے شارحین ایک ہی شعر کی مختلف شرحیں کرتے ہیں جب کہ دونوں متن کلام سے ہی استدلال کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ تفہیم کا ہے اور جو زبانیں ایک دوسرے سے جتنی زیادہ مختلف ہوتی ہیں ان کے باہمی تراجم کے مابین یہ مسئلہ اتنا ہی نمایاں ہوتا ہے تاہم جن زبانوں کے مابین شعریاتی مماثلت ہوتی ہے ان کے ترجموں میں تفہیم کا مسئلہ شعری جمالیات کی اوٹ میں چھپ جاتا ہے۔

نثری ادب کے تراجم

شعری تراجم کی نسبت نثری ادبی تراجم میں فن پارے کی جمالیاتی قدر کو بہت حد تک منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اردو میں روسی فکشن نگاروں کی تصانیف کے ترجمے ان کی حقیقت پسندی کا کچھ نہ کچھ ذائقہ لے ہی آئے ہیں۔ لیکن تراجم خواہ کتنی ہی بڑی جمالیاتی قدر کے حامل کیوں نہ ہوں دیکھا یہ گیا ہے کہ یہ زمانی حد بندیوں کو اس طرح پار نہیں کر سکتے جیسے کہ اصل تخلیقی متن پار کر جاتا ہے۔ چنانچہ جہاں تخلیقی متن صدیوں تک اپنی چاشنی برقرار رکھتا ہے وہیں ترجمہ چند ہی عشروں کے بعد فرسودہ نظر آنے لگتا ہے۔

نثری ادبی تراجم کے دو معروف طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ مترجم اپنے ممکنہ قاری کے ذوق کا خیال رکھتے ہوئے اپنی ثقافت و معاشرت سے ہم آہنگ ہو کر ترجمہ کرے یا زیادہ سے زیادہ یہ ہو کہ زبانِ آماج والے بھی زبانِ متن میں پیش کیے گئے فن پارے کی کہانی سے آگاہ ہو جائیں۔ ایسے تراجم آزاد تراجم کے نام سے معروف ہیں اور اس ضمن میں سب سے نمایاں ترجمہ ہسپانوی تخلیق ڈان کیہوتے کا اردو ترجمہ ہے جو پنڈت رتن ناتھ سرشار نے کیا تھا۔ اس طرح کے تراجم بالعموم اپنے دور کے مقبول تراجم ہوتے ہیں لیکن یہ بھی اصل تخلیقی متن کی طرح زمانی حد بندیوں کو توڑ نہیں پاتے اور ایک محدود وقت کے بعد فرسودہ ہو جاتے ہیں۔ اس انداز پر گوئٹے کا اعتراض یہ ہے کہ:

> ہمارے مترجمین اپنی زبان کے محاورے کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ اصل کارناموں کی روح کو گرفت میں لانے سے کہیں زیادہ کسی مترجم کی بنیادی غلطی یہی ہے کہ وہ اپنی زبان کی موجودہ حالت کو برقرار رکھنے پر مصر رہے اور اس کو غیر زبان سے کوئی زوردار اثر قبول نہ کرنے دے۔ لازم ہے کہ اس (غیر) زبان کی مدد سے اپنی زبان میں وسعت اور گہرائی پیدا کی جائے۔[۱۹]

تخلیقی متن کے ترجمے کے دوسرے طریقے میں متن کو بنیاد بنا کر ترجمہ کیا جاتا ہے اور عُرف عام میں اسے پابند ترجمہ کہا جاتا ہے۔ پابند ترجمے میں مترجم متن کے مواد کو اس کی ہیئتی یا عروضی جکڑ بندیوں کے ساتھ دوسری زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس عمل کے دوران ترجمے میں وہ جمالیاتی قدر پیدا نہیں ہو پاتی جس سے زبان آماج کے وابستگان مانوس ہوتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ پابند ترجمہ زبان آماج کے وابستگان کے لیے بالعموم بہت کم جمالیاتی قدر رکھتا ہے لیکن نثری ادبی تراجم کے ضمن میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اگر متن مترجم کی طبیعت سے قبولیت پالے اور وہ جذباتی سطح پر فن پارے سے ہم آہنگ ہوجائے تو ترجمے میں تخلیقی شان پیدا ہو سکتی ہے۔ ادبیاتِ عالم میں ایسی مثالیں تلاش کی جا سکتی ہیں جن میں ترجمے اصل متن سے بھی بڑھ کر جمالیاتی قدر کے حامل قرار پائے۔ مثال کے طور پر مارسل پروست نے اپنے ناول گُم گشتہ وقت کی تلاش کے انگریزی ترجمے کو اصل فرانسیسی کے متن سے فزوں تر قرار دیا ہے۔[۲۰] اسی طرح لاطینی امریکا کے مشہور ادیب گیبریل گارسیا مارکیز نے اپنے ناول ایک صدی، تنہائی کی کو انگریزی میں پڑھا تو اسے اصل ہسپانوی زبان کی نسبت قابل ترجیح سمجھا۔[۲۱] اسکاٹ مونکریف (Charles Kenneth Scott Moncrieff) نے پروست کی تحریروں کا جو ترجمہ کیا ہے وہ خود مصنف کی رائے میں اصل سے بہتر ہے۔[۲۲]

مترجم کے لیے اپنی زبان آماج کے محاورے سے صرف نظر کرنے کی گوئٹے کی تحریک کو محمد حسن عسکری کے نقطۂ نظر سے مزید مہمیز ملتی ہے جو اپنے مضمون ''اگر ترجمے سے فائدہ اٹھانا ہے'' میں آزاد تراجم کے معروف رویے کا حوالہ دیتے ہیں کہ:

> اردو والے ترجمے میں بس اتنی بات دیکھتے ہیں کہ روانی اور سلاست ہو اور پڑھتے

ہوئے ایسا لگے جیسے کتاب اردو میں لکھی گئی ہے۔[۲۳]

یہاں وہ سوتے میں بھی یہ کام کر سکنے کا دعویٰ کرتے ہوئے سوال اٹھاتے ہیں کہ "اس سے اردو ادب کو کیا فائدہ پہنچا؟"[۲۴]

عسکری صاحب کے خیال میں اردو کی اسلوبیاتی تحدید کی وجہ یہ ہے کہ اردو میں جملہ فعل پر ختم ہوتا ہے بالخصوص ماضی کے صیغے استعمال کرتے ہوئے تا تھا، تے تھے وغیرہ کی تکرار سے نثر کا آہنگ برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔اور پھر جملہ اگر ذرا سا لمبا ہو جائے تو اس میں چار پانچ دفعہ "کا" "کی" "کے" "کہ" آتا ہے جو ایک اور مستقل سر درد ہے۔ یہاں وہ اردو میں رومانیت پسندوں کے ادبی تراجم کے اسلوبیاتی فوائد کو نشان زد کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ "انھوں نے آسکر وائلڈ(Oscar Wilde) کی سی چستی پیدا کرنے کے لیے فعل کے بغیر جملے لکھنے کا تجربہ کیا اور اس سے اردو کی ابلاغی استعداد میں وسعت آئی کیونکہ کبھی کبھی دُم کٹے جملوں کی ضرورت ہوتی ہے۔"[۲۵]

۱۹۳۶ء کے آس پاس ہونے والے فرانسیسی اور روسی افسانوں کے تراجم سے اردو کی ابلاغی استعداد کو پہنچنے والے فائدے کا حوالہ دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ان سے اردو نثر نے غیر جذباتی بیان اور ایک ہی جملے میں کسی چیز کے مختلف اجزا کے نام گنوانے کا طریقہ سیکھا اور آج اردو افسانوں میں جو زبان استعمال ہوتی ہے وہ انھی ترجموں کی بدولت وجود میں آئی ہے۔[۲۶]

عسکری صاحب نے مترجمین کے جن حلقوں کے نام گنوائے ہیں ان میں اور خود عسکری صاحب کے ترجموں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اول الذکر اگر اپنے تراجم میں کوئی اسلوبیاتی افادہ زبان متن سے منتقل کرنے میں کامیاب ہوگئے تو یہ کام سراسر لاشعوری طور پر ہوا۔عسکری صاحب کے ہاں زبان متن کے اسلوبیاتی خصائص اردو میں منتقل کرنے کا شعوری اہتمام ایسا رویہ ہے جو اردو میں دوسری مرتبہ اس بلند آہنگی کے ساتھ نظر آتا ہے۔عسکری صاحب نے اپنے تراجم کے دوران اسلوب کو منتقل کرنے کے حوالے سے اپنی نارسائیوں کا مفصل اظہار کیا ہے تاہم ان کی ستارہ یابادبان سے کوئی چار برس قبل یہی احساس ہمیں ایک اور مترجم جمیل جالبی کے ہاں ہلکے سروں میں نظر آتا ہے۔ایلیٹ کے مضامین کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۹ء میں منظر عام پر آیا تھا۔اس کے پیش لفظ میں ترجمے کے حوالے سے

اپنے نظریات کو یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> ترجمے کے ذریعے زبان ایک نئے مزاج سے آشنا ہوکر پھیلتی اور بڑھتی ہے۔ نئے لہجے اور جملوں کی نئی ساخت کو اپنے مزاج میں جذب کرکے اظہار کی نئی قوتوں سے متعارف ہوتی ہے۔ ترجمے کی اہمیت یہی ہے کہ ایک طرف تو اس کے ذریعے نئے خیالات زبان میں داخل ہوتے ہیں جس سے ذہنی جذب و قبول کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ دوسرے زبان کی قوت اظہار میں نئے امکانات پیدا ہونے لگتے ہیں اور وہ زبان بھی سنجیدہ خیالات کے بیان پر قدرت حاصل کرکے احساس و خیال کی نئی نئی تصویریں ابھارنے کی اہل ہوجاتی ہے .... ترجمہ اس طور سے کیا جائے کہ اس میں مصنف کے لہجے کی کھنک بھی باقی رہے، اپنی زبان کا مزاج بھی باقی رہے اور ترجمہ اصل متن کے بالکل مطابق ہو۔ ترجمے کی یہ شکل سب سے زیادہ مشکل ہے۔ ایسے ترجمے سے زبان کے بیان کو ایک فائدہ تو یہ پہنچتا ہے کہ زبان کے ہاتھ بیان کا ایک نیا سانچہ آجاتا ہے، دوسرے جملوں کی ساخت ایک نئی شکل اختیار کرکے اپنی زبان کے اظہار کے سانچوں کو وسیع تر کردیتی ہے۔[۲۷]

عسکری صاحب کے تراجم کا موضوع 'افسانوی ادب' ہے جب کہ جالبی صاحب کے بیشتر تراجم کا تعلق 'تنقید' سے ہے لیکن اس کے باوجود ترجمے کے حوالے سے دونوں اساتذہ کے نقطۂ نظر میں حیران کن مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں نے تراجم کے حوالے سے اپنے تجربات میں اپنی نارسائیوں کا اعتراف کیا ہے۔ دونوں نے اعجازِ فن کو عجزِ فن کے اظہار سے متوازن کیا ہے۔ لیکن عجزِ فن کا یہ احساس ایک منفرد بصیرت کا زائیدہ ہے۔ دراصل ان دونوں نابغہ روزگار شخصیات نے مترجم کو روایتی سہل انگاری سے ہٹا کر ایک عظیم الشان، جامع اور مترفع منصب عطا کیا۔ چنانچہ جب وہ اپنے وضع کردہ اس معیار پر اپنے آپ کو پرکھتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو کچھ کم پاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی تیسرا دور دور تک اس منصب کے قریب نہیں ہے۔ عسکری اور جالبی پیچیدہ متون کے ترجمے میں جس چیز کو منتقل کرنے کی جانب اشارہ کررہے ہیں وہ متن کی 'ماورائے معالمت' (meta supposition) ایسی نفیس اور لطیف ترین پرت ہے جسے کسی فن پارے کا آہنگ یا اسلوب قرار دیا جاسکتا ہے۔ اصطلاح میں اسے ہی نقل کلام کہا جائے گا۔ اگرچہ ہم کسی دوسری زبان کے فن پارے کے آہنگ یا اسلوب کو مکمل طور پر شاید کبھی

بھی زبان آماج میں منتقل نہیں کرسکتے لیکن ترجمے سے پہلے اس ادراک کی بدولت کسی بھی خاص فن پارے کے کچھ اجزا تو زبان آماج میں منتقل کیے ہی جاسکتے ہیں جو اس شعوری ادراک کی عدم موجودگی میں شاید اس مقدار میں بھی منتقل نہ ہوسکیں۔ بقول ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کے:

> افسانوی ادب کے ترجمے کی بات اور ہے۔ ایسی صورت میں دو تہذیبیں ایک دوسرے کے مدمقابل ہوتی ہیں۔ ایک تہذیبی سانچے کو دوسرے تہذیبی سانچے میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ ویسے تو ہر زبان کا ہر لفظ اپنی تہذیب کا نمائندہ ہوتا ہے۔ لفظوں کو آپس میں جوڑنے سے جملے کی ساخت بنتی ہے۔ ہر جملے کا ایک آہنگ ہوتا ہے۔ پھر جملے آپس میں مل کر اسلوب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ پورے افسانے یا ناول میں ایک فضا کی تعمیر ہوتی ہے لہٰذا افسانوی ادب کے ترجموں میں ترجمہ محض لفظ کا نہیں ہوتا۔ جملوں کی ساخت اور آہنگ نیز اسلوب کی بنت کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے پھر اسے اپنی زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ آخری اہم بات یہ ہے کہ افسانے یا ناول کی تہذیبی فضا کے پیش نظر ایسی لفظیات سے کام لینا پڑتا ہے جو ترجموں میں پوری فضا کو منتقل کرسکے۔[۲۸]

ترجمے کے عمل میں متن کی یہ ماورائے معاملت پرت بہت آہستگی لیکن پائیدار طریقے سے اپنا اظہار کرتی ہے۔ یہ نئے نئے ذائقوں سے آشنا کر کے نئے ذوق کی تشکیل کرتی ہے اور پرانی جمالیاتی اقدار میں غیر محسوس طور پر تغیر وتبدل کا سبب بنتی ہے۔ مرزا حامد بیگ جب یہ کہتے ہیں کہ:

> اردو ادب میں تذکرے کی جگہ تنقید، داستان اور تمثیل کی جگہ ناول، رَہس اور نوٹنکی کی جگہ ڈراما اور کہانی کی جگہ افسانے جیسی جدید اصناف نے لے لی اور ادبیاتِ عالم کے ساتھ قدم بہ قدم چلنے کا خواب ہم نے پہلی بار دیکھا۔ یہ محض ہیئت کی سطح پر ہی تبدیلیاں نہ تھیں بلکہ مضمون کے ساتھ ادبی رویے کی تبدیلیاں بھی تھیں اور قدامت پسندی کی زنجیروں سے آزاد ہوکر نئے زمانے میں سانس لینے کا جتن بھی تھا۔[۲۹]

تو دراصل وہ ترجمے کی اسی ماورائے معاملت پرت کی بابت ہی بات کر رہے ہوتے ہیں۔

ترجمے کے ابتدائی دور کو ہم ذوق پروری کے ابتدائی دور کی رعایت دے سکتے ہیں۔ اس وقت کے مترجم کے سامنے ترجمے کی اعلیٰ مثالیں موجود نہیں تھیں چنانچہ اس دور میں جو ترجمے ہوئے انھیں آج دیکھنے میں

ہمیں بدسلیقگی کا احساس ہوسکتا ہے۔ مثلاً میکنزی (Donald Mackenzie Wallace) نے مسز مشروم (Mrs. Mushroom) کی ذات کے حوالے سے ہندوستانیوں کا خوب مضحکہ اڑایا اور رتن ناتھ سرشار نے اس حقیقت سے ناواقفیت (اور غالباً صرف ہندوستانیوں کے تذکرے کے محرک) کی وجہ سے اس کی ایک کتاب اعمال نامہ روس کا ترجمہ کیا۔[۳۰] مرزا حامد بیگ کے بقول اس دور کے ترجموں کا نقص یہ ہے کہ "وہ مستند اور اہم کتابوں کے ترجمے نہیں تھے۔"[۳۱] جس کے ہاتھ جو متن لگا وہ لے دوڑا، ایک ایک متن کے کئی کئی بار ترجمے ہوئے اور مترجمین نے اصل متن سے رجوع تک نہیں کیا۔ لیکن یہاں یہ ذہن نشین رہے کہ یہ اردو کا مغربی ادب کے تراجم سے پہلا تعارف تھا چنانچہ لندن کے بازاروں میں جمن حلوائی کی موجودگی پر ہمیں زیادہ چیں بہ جبیں نہیں ہونا چاہیے۔

سرسید کی تحریک کے دوران کیے گئے تراجم نے پہلی مرتبہ مقامی نظریہ سازی (indigenous theorization) کی چنگاری روشن کی (جو بدقسمتی سے 'پیرویِ مغرب' کے بوجھ تلے دب کر جلد ہی خاکستر ہوگئی)۔

اس تحریک کی دوسری عطا انفس سے آفاق کی جانب رجوع کرنے کا رویہ تھا۔ یہ دوسرا رویہ ایک زیریں لہر کے طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اردو ادب کا حصہ ہوگیا۔ مقامی نظریہ سازی کا نقطۂ عروج اقبال کی طبع زاد شاعری ہے جب کہ خود اقبال نے جو تراجم کیے ہیں ان میں انفس پر آفاق کو ترجیح دینے کی دوسری زیریں لہر کو برتا۔

اسی عرصے میں ترجمے کے ضمن میں ایک اور زبردست اختراعی شخصیت روایت سے کٹ کر اسی طرح اپنی الگ راہ بنانے میں مصروف تھی جیسے اردو شاعری کے کلاسیکی دور میں نظیر اکبر آبادی نے بالکل الگ راستہ اپنایا تھا۔ یہ شخصیت مرزا ہادی رسوا کی تھی جنھوں نے ماری کوریلی (Marie Corelli) کے پانچ جاسوسی ناولوں کو خونی بھید، خونی جورو، خونی مصور اور بہرام کی رہائی کے نام سے، ۱۸۶۸ء تک طبع کرا دیا تھا۔[۳۲] یہ اثر پذیری پھر ظفر عمر سے ہوتی ہوئی ابن صفی کے اوج تک پہنچی۔

عبدالحلیم شرر نے خوبیِ قسمت کے نام سے جو ناول لکھا اسے انگریزی ادب سے ترجمہ

قرار دیا جاتا ہے۔ مرزا حامد بیگ کے مطابق "ان کے تاریخی ناولوں کی تمام تر عمارت سر والٹر اسکاٹ اور رچرڈسن کی بنیادوں پر کھڑی ہے۔"[۳۳] تاریخی ناولوں کے تراجم کی یہ روایت عزیز احمد کے ہاں منتقل ہوئی جنھوں نے ہیرالڈ لیمب کے تراجم کیے اور بعدازاں اسی روایت کی کوکھ سے اردو کے وہ بہت سے ناول نکلے جن میں کئی کئی صدیوں اور ہزاریوں کو موضوع بنایا گیا۔

جمال پرستوں کی عمومی عطا کا تذکرہ پچھلے صفحات پر عسکری صاحب کے رشحات کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ ان مترجمین میں معروف نام مولانا حامد علی خاں، لطیف الدین احمد، جلیل قدوائی، مجنوں گورکھپوری اور خواجہ منظور حسین شامل ہیں۔ آزاد تلازمہ خیال اور تحیر کی تکنیک کے استعمال کا تعارف ایڈگر ایلن پو کی تحریروں کے تراجم سے ہوا اس ضمن میں حجاب امتیاز علی، مسز عبدالقادر اور مجنوں گورکھپوری کے نام اہم ہیں۔ روسی نثری ادب کی کاٹ دار اور بے مہر حقیقت پسندی اور فرانسیسی نثری ادب میں اذیت پسندی کی سرحدوں کو چھوتی ہوئی حقیقت پسندی نے ایک خاص اسلوبیاتی شاہکار جنم دیا۔ اس شاہکار کو ہم منٹو کے نام سے جانتے ہیں جس کی تحریروں پر چیخوف، موپساں اور ٹالسٹائی کے اثرات واضح ہیں۔ علامت نگاری معروف مغربی مصنفین کی تحریروں کا ایک وصف ہے جو مترجمین کے توسط سے ہم تک پہنچا اور اس تکنیک کو بعدازاں غلام عباس، انور سجاد اور انتظار حسین نے چابکدستی سے برتا۔ افسانوں کے تراجم سے اردو میں افسانوں کی طبع زاد روایت بھی مستحکم ہوئی۔ اردو میں معاصر ادبی تراجم کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہسپانوی ادب سے بالواسطہ تراجم اپنی مخصوص طلسماتی فضا کے ساتھ پابلو نرودا کی نظموں، اور حال ہی میں آنجہانی ہونے والے گبریل گارسیا مارکیز (Gabriel Garcia Márquez) کے علاوہ پاؤلو کوہیلو (Paulo Coelho) کے تراجم کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

حامد بیگ اردو میں ادبی تراجم کی ابلاغی عطا کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

> اردو میں مغربی زبانوں سے تراجم کا جائزہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اردو زبان و ادب کی وسعت اور گہرائی اور گیرائی میں اخذ و ترجمے کا خاصا اہم کردار رہا ہے۔ مثلاً یہ کہ ادبی تراجم نے نئے اسالیب بیان کو جنم دیا، نئے طرز احساس کو ابھارا، پیرایۂ بیان میں صلابت، متانت اور استدلال پیدا کیا اور پیرایۂ اظہار کے نئے نئے سانچے فراہم کیے۔ نیز یہ کہ نئی نئی اصناف سے آشنا ہی نہیں کیا بلکہ ان اصناف کو فنی وقار بھی بخشا۔[۳۴]

مشینی تراجم

چونکہ ''تراجم انفرادی شوق اور شخصی سعی سے آگے بڑھ کر ٹیکنالوجی کے دور میں داخل ہو چکے ہیں یعنی کمپیوٹر کے ذریعے تراجم کیے جا رہے ہیں''[۳۵] اس لیے یہاں مشینی ترجمے کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا جس میں کمپیوٹر کی یاداشتوں کو استعمال کرتے ہوئے ایک زبان کی معاملت کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ایسی ایک نمایاں کوشش گوگل کا آن لائن ٹرانسلیشن سافٹ ویئر ہے لیکن دیگر زبانوں سے اردو میں تراجم خاصے ناپختہ اور بے ڈھب ہوتے ہیں۔اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ ابھی اردو نے انٹرنیٹ پر بھرپور طریقے سے اپنا اظہار نہیں کیا۔اس کے مقابل فارسی اور عربی کہیں آگے نکل چکی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ چونکہ اس کی ایجاد مغرب میں ہوئی ہے لہٰذا اس میں مغرب کی لسانی اور کسی حد تک تہذیبی قدروں کا خیال رکھا گیا ہے نتیجتاً مختلف مغربی زبانوں کے باہمی تراجم کا معیار کہیں زیادہ بہتر ہے۔ دیگر زبانوں سے اردو میں، اردو سے دیگر زبانوں میں تراجم کے لیے گوگل کو ابھی بہت سی اردو سیکھنا ہوگی۔ ایسی ہی ایک کوشش مائیکروسافٹ کا 'بنگ ٹرانسلیٹر' (bing translator) بھی ہے جس کے بارے میں کمپنی کا دعویٰ ہے کہ ایک عشرے کی تحقیق پر مبنی یہ 'مشینی مترجم' زیادہ لچک کا حامل ہے اور یہ زیادہ بہتر طور پر خودکار طریقے سے 'سیکھ' کر روانی سے ترجمہ کر سکتا ہے۔ ہمارے تجربے میں آیا ہے کہ اردو بول چال کے حوالے سے مشینی تراجم بہتر طور پر معاملت کو منتقل کر سکتے ہیں لیکن علمی اور تحریری معاملت ابھی بہت دور کی بات ہے۔ دونوں پلیٹ فارمز کے مشینی تراجم کا جائزہ لینے سے ایک اور اہم بات یہ سامنے آتی ہے کہ جہاں اردو سے انگریزی میں تراجم کا معیار کافی خراب ہے وہیں انگریزی سے اردو میں تراجم نسبتاً زیادہ بہتر ہیں۔ یہ کیفیت اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو میں تراجم کی سرگرمی کے براہ راست متناسب ہے۔مزید برآں پیچیدہ ادبی متون کی ماورائے معاملت پرت تو ایک طرف یہ مشینی تراجم موزوں حد تک معاملت (اداے مطلب) کی پرت کی منتقلی کے اہل بھی نہیں ہیں۔

تلخیص

کسی بھی زبان کی ابلاغی استعداد کے فروغ میں ترجمے کی مختلف روایتوں کا اہم کردار ہے۔

ترجمے کی بدولت ہی مختلف زبانوں، ادبیات، تہذیبوں، روایتوں اور ثقافتوں میں لین دین ہوتا ہے۔ اردو کی ابلاغی استعداد کی وسعت اور فروغ میں بھی ترجمے کا نمایاں کردار ہے لیکن بدقسمتی سے اردو میں ترجمے کی سرگرمی کے سائنسی اور مفصل جائزوں کی کمی رہی ہے حالانکہ ان جائزوں سے ان مقامات کی نشاندہی ممکن ہوسکتی تھی جن سے مترجم کو شعوری طور پر بچ کر گذرنا چاہیے۔ اس مضمون کا مقصود ترجمے کے عمل کے انھی نمایاں پہلوؤں کو روشنی میں لا کر مترجم کی سعی میں اس کی معاونت کرنا ہے۔

حوالہ جات

* پی ایچ ڈی اسکالر، شعبۂ اردو، فیڈرل اردو یونی ورسٹی، کراچی۔

۱۔ بحوالہ ناصر عباس نیر، متن سیاق اور تناظر (اسلام آباد: پورب اکیڈمی، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۴۔

۲۔ شیخ عبدالرشید، "افسانوی ادب کے تراجم: مسائل اور مشکلات" روزنامہ پاکستان (۱۸ فروری ۲۰۱۴ء)؛
http://dailypakistan.com.pk/columns/18Feb-2014-77462

۳۔ سجاد باقر رضوی، "ترجمہ اور اس کے مسائل" تحریر و سیپ اشاعت خاص شمارہ ۴۹ (جون ۱۹۸۶ء)؛ ص ۲۰۷۔

۴۔ پنکی جسٹن، "بائبل کے اردو تراجم: کہانی سے حقیقت تک"، خیابان جامعہ پشاور شمارہ ۲۲ (۲۰۱۰ء)؛
http://www.khayaban.pk/2010_Bahar(Issue_22)/04_pinky_justin.html

۵۔ طارق محمود "اردو کے سائنسی اور تعلیماتی تراجم کا جائزہ" اردو زبان میں ترجمے کے مسائل مرتب اعجاز راہی (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء)، ص ۵۱۔

۶۔ ایضاً۔

۷۔ ایضاً۔

۸۔ ایضاً، ص ۵۲۔

۹۔ ایضاً۔

۱۰۔ ایضاً۔

۱۱۔ مرزا حامد بیگ، مغرب سے نثری تراجم (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء)، ص ۲۲۳۔

۱۲۔ بلال احمد زبیری، "سماجی علوم کا ترجمہ: مسائل و مشکلات" اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، ص ۱۲۷۔

۱۳۔ طارق محمود، ص ۵۴۔

۱۴۔ صفدر علی، اصول تحقیق و تدوین (لاہور: فاروق سنز، ۱۹۹۹ء)، ص ۲۱۲

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۱۳۔

۱۶۔ قاسم یعقوب، ''اردو میں تراجم: نئی ضروریات اور مسائل'' (۹ دسمبر ۲۰۱۲ء)۔ ۳۔

http://nlpd.gov.pk/uakhbareurdu/december2012/Dec_9.html

۱۷۔ رؤف پاریکھ، مرتب اردو لغات: اصول اور تنقید (کراچی: فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، ۲۰۱۴ء)، ص ۴۲۔

۱۸۔ خلیق انجم، فن ترجمہ کاری (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۵ء)، ص ۱۴۰۔

۱۹۔ بحوالہ مظفر علی سید، ''فن ترجمہ کے اصولی مباحث'' اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، ص ۴۲۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۳۵۔

۲۱۔ ایضاً۔

۲۲۔ محمد حسن عسکری، ستارہ یا بادبان (کراچی: مکتبہ سات رنگ، ۱۹۶۳ء)، ص ۱۲۶۔

۲۳ ایضاً، ص ۱۴۷۔

۲۴۔ ایضاً۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۲۹۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۷۰۔

۲۷۔ جمیل جالبی، ایلیٹ کے مضامین (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء)، ص ۹۔

۲۸۔ سجاد باقر رضوی، ''افسانوی ادب کے تراجم: مسائل اور مشکلات'' اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، ص ۱۹۹۔

۲۹۔ مرزا حامد بیگ، ''اردو زبان میں ادبی تراجم کا جائزہ'' اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، ص ۸۰۔

۳۰۔ ایضاً۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۸۱۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۸۵۔

۳۳۔ ایضاً۔

۳۴ مرزا حامد بیگ، مغرب سے نثری تراجم، ص ۳۸۔

۳۵۔ سلیم اختر، اردو زبان کیا ہے؟ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص ۳۳۴۔

مآخذ

اختر، سلیم۔ اردو زبان کیا ہے؟۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔

انجم، خلیق۔ فن ترجمہ کاری۔ کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۵ء۔

بیگ، مرزا حامد۔ ''اردو زبان میں ادبی تراجم کا جائزہ''۔ اردو زبان میں ترجمے کے مسائل۔ مرتب اعجاز راہی۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۷۹ تا ۹۴۔

______۔ مغرب سے نثری تراجم۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء۔

پاریکھ، رؤف۔ مرتب اردو لغات۔ کراچی: فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، ۲۰۱۴ء۔

جالبی، جمیل۔ ایلیٹ کے مضامین۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء۔

جسٹس، پنکی۔ "بائبل کے اردو تراجم: کہانی سے حقیقت تک"۔ خیابان جامعہ پشاور شمارہ ۲۲ (۲۰۱۰ء)۔

رضوی، سجاد باقر۔ "افسانوی ادب کے تراجم: مسائل اور مشکلات"۔ اردو زبان میں ترجمے کے مسائل۔ مرتب اعجاز راہی۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۱۷۹ تا ۲۰۲۔

________۔ "ترجمہ اور اس کے مسائل"۔ تجدیدِ سیپ اشاعت خاص، شمارہ ۴۹ (جون ۱۹۸۶ء)۔

زبیری، بلال احمد۔ "سماجی علوم کا ترجمہ: مسائل اور مشکلات"۔ اردو زبان میں ترجمے کے مسائل۔ مرتب اعجاز راہی۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۱۲۵ تا ۱۳۴۔

سید، مظفر علی۔ "فن ترجمہ کے اصولی مباحث"۔ اردو زبان میں ترجمے کے مسائل۔ مرتب اعجاز راہی۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۳۱ تا ۶۳۔

عبدالرشید، شیخ۔ "افسانوی ادب کے تراجم: مسائل اور مشکلات"۔ روزنامہ پاکستان (۱۸ فروری ۲۰۱۴ء)۔

عسکری، محمد حسن۔ ستارہ یا بادبان۔ کراچی: مکتبہ سات رنگ، ۱۹۶۳ء۔

علی، صفدر۔ اصول تحقیق و تدوین۔ لاہور: فاروق سنز، ۱۹۹۹ء۔

محمود، طارق۔ "اردو کے سائنسی اور تعلیمی تراجم کا جائزہ"۔ اردو زبان میں ترجمے کے مسائل۔ مرتب اعجاز راہی۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۴۷ تا ۷۳۔

نیر، ناصر عباس۔ متن سیاق اور تناظر۔ اسلام آباد: پورب اکیڈمی، ۲۰۱۳ء۔

یعقوب، قاسم۔ "اردو میں تراجم: نئی ضروریات اور مسائل" (۹ دسمبر ۲۰۱۲ء)۔